www.rahimia.org

شریعت، طریقت اور اجتماعیت پر مبنی دینی شعور کا نقیب

ماہنامہ رحیمیہ لاہور

ستمبر 2026ء / ربیع الثانی ۱۴۴۸ھ

جلد نمبر 18، شمارہ نمبر 9 قیمت: 40 روپے ● سالانہ ممبرشپ: 450 روپے

بانی

حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری

قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ السَّعِیْد مسند نشین رابع خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

مدیرِ اعلیٰ

حضرت اقدس مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

جانشین حضرت اقدس رائے پوری رابعؒ

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن (سرپرست)

مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی (صدر)

مولانا مفتی محمد مختار حسن (صدر انتظامیہ)

انیس احمد سجاد ایڈووکیٹ (مدیر)

ترتیبِ مضامین

- انسانی سماج کی تشکیل میں حلال اور پاکیزہ کھانے کی اہمیت
- مؤمنانہ فراست کا تقاضا
- حضرت حارثہ بن نعمان انصاری خزرجی نجاری رضی اللہ عنہ
- قومی بحران سے قومی تشکیلِ نو تک؛
- عدل اور عوامی اعتماد پر قائم اجتماعی نظام کی ناگزیر ضرورت
- ''نفس'' سے متعلق ''مقامات'' (4)
- دینِ اسلام کا مطمحِ نظر؛ انسانی سماج
- انبیا علیہم السلام کی جدوجہد کا محور؛ نظامُ المدینہ
- مقصدِ بعثتِ نبوی ﷺ؛ فرد سے لے کر اقوام تک کی تہذیب
- خیر کے فقدان سے دینی نظام کا زوال
- سلطان سلیم اول کی دیگر فتوحات اور حرمین شریفین کی سرپرستی و خدمات
- حضرت مولانا شائق احمد عثمانی بھاگلپوریؒ
- دینی مسائل

ارشادِ گرامی حضرت اقدس مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ مسند نشینِ ثانی خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

''اگر مَیں خود، یا میرا کوئی ساتھی بیمار ہو تو مجھے بڑی تشویش ہوتی ہے، حال آں کہ بادی النظر میں یہ توکُّل (اللہ پر قلبی اعتماد) کے خلاف ہے، لیکن حقیقتاً توکُّل کے خلاف نہیں۔ کیوں کہ (وجہ یہ ہے کہ) انسان اگر بیمار ہوگا تو سلوک (قربِ الٰہی کے حصول) میں ترقی نہیں کرسکتا اور صحت کا اہتمام نہ کرنا بھی ذمہ داری میں کوتاہی ہے۔

جس طرح موت جب اور جیسے ہوتی ہے، مقدر (اللہ تعالیٰ کے ہاں مقرر) ہوتی ہے، مگر خودکشی کرنے والے کو شریعت مجرم قرار دیتی ہے، اسی طرح بیماری، صحت — خواہ مقدرات سے ہو — مگر کوتاہی کرنے والا کوتاہی کر رہا ہے۔ اور انسان کی صحت پر، اس کی حقیقی ترقی، یعنی: ہمیشہ کی آرام دہ زندگی پر منحصر ہے (کہ اسی صورت میں اعمالِ خیر بجالاتا ہے)''۔

(۱۸/محرم الحرام ۱۳۶۶ھ/ 13/دسمبر 1946ء، بروز: جمعہ، مقام: ڈھڈیاں)

(ارشادات حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، ص: 251، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس، 33/A، کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور
0092-42-36307714,36369089-www.rahimia.org
Email: info@rahimia.org

www.rahimia.org

تفسیر: شیخ التفسیر مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

انسانی سماج کی تشکیل میں حلال اور پاکیزہ کھانے کی اہمیت

گزشتہ آیات (2-البقرہ: 163 تا 167) میں ذکر تھا کہ انسانی اجتماعیت کی تشکیل کے لیے معاشی وسائل کی فراہمی اللہ تبارک وتعالیٰ کی تخلیق سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وقت کے فرعون اور ظالموں کو شریک ٹھہرانا ایسا بڑا ظلم عظیم ہے، جو دنیا اور آخرت میں سزا اور عذاب کا مستحق ہے۔ انسانی اجتماعیت کے سچے رہنما' اللہ تبارک وتعالیٰ سے سچی محبت کرتے ہیں اور اس کے طے کردہ قوانین کے تحت معاشی وسائل استعمال کرتے ہیں۔

اب ان آیات (2-البقرہ: 168 تا 171) میں انسانی اجتماعیت میں کھانے پینے سے متعلق الٰہی اُصول اور احکامات واضح کیے گئے ہیں۔ انسانیت کا اصل دشمن شیطان ہے، جو لوگوں کو اپنے قدموں کے پیچھے چلاتا ہے، انھیں گمراہ کر کے عقل و شعور سے عاری کر دیتا ہے اور انسانیت کو اپنے اصل مقام سے گرا کر حیوانیت تک پہنچا دیتا ہے۔

یَاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ﳓ (اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ): انسانوں کی سب سے بڑی ضرورت معاشی وسائل کو استعمال کر کے اپنے کھانے پینے کی حاجات کا بندوبست کرنا ہے۔ کوئی انسان کھائے پیے بغیر اس دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ کھانا پینا اُس کی بنیادی حاجت ہے۔ یہ حاجت کیسے پوری کی جائے؟ اُس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اچھے اور بُرے کھانے پینے میں تمیز کرے اور حلال و حرام کے حوالے سے شرعی قانون کی پابندی کرے۔ اسی طرح بُرے اور بدبودار کھانوں سے بھی پرہیز کرے۔ اپنی اجتماعی طرزِ زندگی کو قانون کا پابند بنائے اور صحیح خطوط پر استوار کرے۔

ملّتِ ابراهیمیه حنیفیه انسانیت کے لیے ایسا قانون واضح کرتی ہے کہ جس سے اچھے اور بُرے کھانے پینے کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔ اس ملت کے بنیادی قوانین میں یہ ہے کہ دنیا میں انسانیت کی بقا' پاکیزہ اور حلال کھانے سے وابستہ ہے۔ اس لیے انسانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ زمین میں موجود وسائلِ معاش کو استعمال میں لا کر حلال اور پاکیزہ کھانا کھائیں، اس لیے کہ انسانیت کا تمدنی ارتقا اس کے بغیر ممکن نہیں۔

اس آیت میں ''حلال'' اور ''طیب'' اشیا کھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ ''حلال'' کی ضد ''حرام'' ہے اور ''طیب'' کی ضد ''خبیث'' ہے۔ **ملّتِ ابراهیمیه حنیفیه** میں معاشی وسائل کو دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنے استعمال میں لانا ہے، یعنی: اپنی محنت سے کمائے ہوئے مال یا خرید و فروخت وغیرہ جائز طریقے سے حاصل شدہ وسائل کو کھانے پینے میں استعمال کرنا ''حلال'' کہلاتا ہے اور انسانی اجتماعیت کو فکری و عملی حوالے سے نقصان پہنچانے والے جن اُمور سے **شریعتِ محمدیه** ﷺ نے روکا ہے، وہ ''حرام'' ہیں۔ انسانوں کو کھانے پینے میں حلال چیز استعمال کرنی ہے اور حرام چیزوں سے اپنے آپ کو بچانا ہے، جیسے اگلی آیت (173) میں ''**لحم الخنزیر**'' (خنزیر کے گوشت) اور ''**ما اُهِلّ به لغیر اللّٰه**'' (غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانور) کو کھانا حرام قرار دیا گیا۔

دوسرے یہ کہ کھانے پینے کی چیزیں انسانی فطرت کے مطابق ''طیب'' اور پاکیزہ ہونی چاہئیں۔ انسانی جسم کو نقصان پہنچانے والی ''خبیث''، بدبودار اور ناپاک چیزیں نہیں ہونی چاہئیں۔ ایسی غذا جو جسم میں جا کر سڑانڈ پیدا کرے، اُس کی نشوونما میں رُکاوٹ پیدا کرے، وہ اپنے اندر خباثت رکھتی ہے، جو انسانی جسم کو بھی نقصان پہنچاتی ہے، اس لیے اُن خبیث چیزوں سے بچنا بھی ضروری ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت (173) میں ''**المَیْتَة**'' (مُردار) اور ''**الدّم**'' (خون) کا ذکر کیا گیا ہے۔ حلال اور طیب غذائیں انسانیت کی ترقی کے لیے لازمی اور ضروری ہیں۔

وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ (اور پیروی نہ کرو شیطان کی، بے شک وہ تمھارا دشمن ہے صریح): انسانیت کی اجتماعی ترقی اور تمدنی ارتقا قانونِ خداوندی کے مطابق صحیح کھانے پینے سے وابستہ ہے۔ اس کے مقابلے میں شیطان' انسانیت کا واضح دشمن ہوتے ہوئے انسان کو ایسی راہ پر لگا دیتا ہے، جس پر چلنے والے قدم انسانی اجتماعیت کو توڑ دیتے ہیں۔ شیطان انسانوں کو لاقانونیت سکھا کر خواہشات کی اتباع کرنے کی راہ دکھاتا ہے۔ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے حلال و حرام کی تمیز کے بغیر دوسرے انسانوں کے حقوق توڑنے کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ نفسانی خواہشات کا غلام بنا دیتا ہے۔ اس لیے اُس کے قدموں کی پیروی نہ کی جائے۔ وہ تمھارا واضح دشمن ہے۔ دشمن کو سمجھ کر اُس کی راہ پر نہ چلنا ہی انسانیت کی اجتماعی ترقی کا راستہ کھولتا ہے۔

اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ (وہ تو یہی حکم کرے گا تم کو کہ بُرے کام اور بے حیائی کرو): شیطان کا کام انسانیت کو انسانی اجتماعیت کے بنیادی قانونِ الٰہی سے لاپرواہ کرنا ہے۔ وہ اللہ کے احکامات: ''حلال'' اور ''طیب'' پر مبنی قوانین کے مقابلے پر ''**سُوْء**'' اور ''**فَحْشَاء**'' کا حکم دیتا ہے۔ ''**سُوْء**'' (بُرے کام) سے مراد وہ چیزیں جو خبیث ہیں اور انسانی اجتماعیت کو نقصان پہنچانے والی ہیں، ان کا استعمال حرام ہے۔ اور انسانی اجتماعیت میں ایسے کاموں کا ارتکاب کرنا ''**الفحشاء**'' ہے، جو انسانیت سے شرم و حیا چھین لیں اور اُن کی اجتماعیت کو توڑ کر حیوانوں کی سطح تک پہنچا دیں۔

وَ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (اور جھوٹ لگاؤ اللہ پر وہ باتیں، جن کو تم نہیں جانتے): شیطان یہ چاہتا ہے کہ تم اللہ پر وہ بات کہو، جو تم نہیں جانتے۔ جب انسان اپنی خواہشات پر عمل کرتے ہوئے ''**سُوْء**'' اور ''**فَحْشَاء**'' کا ارتکاب کرتا ہے اور خواہش پرست بن جاتا ہے تو وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستے پر نہیں چلتا ہے۔ ایسا راستہ جو مقربینِ بارگاہِ الٰہی انبیا اور فرشتوں کے اجتماعی مقام ''حظیرۃ القدس'' کے ذریعے اللہ سے جوڑتا ہے۔ اُس کے اجتماعی فیصلوں کو توڑتا ہے۔

اللہ کی طرف جانے کا راستہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے ''ملاءِ اعلیٰ'' کے واسطے سے اللہ کی معرفت حاصل کر کے وہاں کے طے کردہ قوانین کی پابندی کرنے

www.rahimia.org

سے وابستہ ہے۔ اور کامل انسان ہی اسی راستے سے اللہ تک پہنچتے ہیں۔ ان رہنماؤں کے مقرر کردہ راستے سے ہٹ کر اللہ کے ماننے کا دعویٰ کرنا ایک ایسی بات زبان سے نکالنا ہے، جس کی حقیقت کو وہ جانتے نہیں ہیں۔ انبیائے حنیفیہ کے علمی اور عملی راستے سے ہٹ کر بات کرنا' اللہ کے بارے میں ایسی جہالت کا اظہار کرنا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی اَور جہالت نہیں ہوسکتی۔ یہ ایسی بات ہے، جس کا تمھیں کوئی علم نہیں ہے۔ دراصل شیطان تمھیں اس غلط راستے پر چلا کر انسانیت کے اعلیٰ مقام سے نیچے گرانا چاہتا ہے۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ (اور جب کوئی ان سے کہے کہ: تابع داری کرو اُس حکم کی، جو کہ نازل فرمایا اللہ نے، تو کہتے ہیں: ہرگز نہیں! ہم تو تابع داری کریں گے اس کی، جس پر دیکھا ہم نے اپنے باپ دادوں کو): انسانیت کی ترقی اُن قوانین پر ہے، جو فطرتِ انسانیت کے موافق ہیں۔ اور فطرتِ انسانیت سے مطابقت رکھنے والے قوانین اللہ تعالیٰ نے ''حظیرۃ القدس'' سے ملتِ ابراھیمیہ حنیفیہ کے انبیا علیہم السلام پر نازل کیے ہیں۔ جب اللہ کے نازل کردہ ایسے قوانین کے اتباع کی دعوت دی جاتی ہے تو یہ مشرکین کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے آباؤاجداد کے طے کردہ قوانین کی پیروی کرتے ہیں۔

اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ (بھلا اگرچہ ان کے باپ دادے نہ سمجھتے ہوں کچھ بھی اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ): اس آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ اپنے آباؤاجداد کے دین کو فطری سمجھتے ہیں، جب کہ صورتِ حال یہ ہے کہ انسانیت کے فطری قوانین کے لیے دو چیزیں؛ ''عقل'' اور ''ہدایت'' ضروری ہیں۔ ان کے آباؤاجداد عقل سے ماورا پتھروں کی پوجا کرتے اور انھیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ بے جان اور کمزور اشیا کو خدا ماننا کون سی عقل کی بات ہے؟ فطرت پر مبنی انسانی عقل اس سے انکار کرتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر دور کے سچے رہنماؤں کے تسلسل اور اُن کی ہدایت سے انسانی اجتماعیت کی ترقی کے قوانین سیکھے جاتے ہیں۔ اگر ان کے مزعومہ آباؤاجداد نے نہ تو عقل سے کام لیا اور نہ ہی ان کے پاس ملّتِ ابراھیمیہ حنیفیہ کے بڑے ائمہ اور رہنماؤں کی ''حظیرۃ القدس'' سے حاصل کردہ ہدایت ہے، تو پھر اُن کی اتباع کیسے کی جاسکتی ہے؟ عقل سے ماورا اور سچے راستے کے تسلسل کے بغیر اتباع کرنا' جانوروں کی طرح بڑی بے عقلی اور بے ہدایتی ہے۔

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ (اور مثال ان کافروں کی ایسی ہے، جیسے پکارے کوئی شخص ایک چیز کو جو کچھ نہ سنے سوا پکارنے اور چلانے کے): ان کافروں کی مثال تو لاقانونیت کے حوالے سے ایسے ہی ہے، جیسے لاقانونیت پر مبنی جنگل کے جانوروں کو پکارا جائے کہ جو سوائے آواز اور شور شرابے کے اَور کچھ نہیں سنتے۔

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ: ''یعنی: ان کافروں کو راہِ ہدایت کی طرف بلانا ایسا ہے، جیسا کہ کوئی جنگل کے جانوروں کو بلائے کہ وہ سوائے آواز کے کچھ نہیں سمجھتے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے، جو خود علم نہ رکھیں اور نہ علم والوں کی بات قبول کریں''۔

انسانی معاشرے قوانین کی پابندی سے ترقی کرتے ہیں اور جس معاشرے میں لاقانونیت عروج پر ہو اور ہر فرد اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے انسانیت کے فطری اجتماعی قوانین کو توڑے تو گویا کہ اُس معاشرے میں جنگل کا قانون نافذ ہے، جہاں سوائے شور شرابے کے اَور کچھ سنائی نہیں دیتا۔ حیوانیت کی سطح پر اُترنے والے زوال پذیر معاشروں کا قرآن نے نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اس سے ہر دور کے انسانی معاشرے کے تجزیہ کرنے کا اُصولی طریقہ کار واضح ہوجاتا ہے۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (بہرے، گونگے، اندھے ہیں، سو وہ کچھ نہیں سمجھتے): حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ: ''یعنی: یہ کفار گویا: (1) بہرے ہیں، جو حق بات بالکل نہیں سنتے۔ (2) گونگے ہیں، جو حق بات نہیں کہتے۔ (3) اندھے ہیں، جو راہِ مستقیم (سیدھی راہ) نہیں دیکھتے۔ سو! وہ کچھ نہیں سمجھتے، کیوں کہ جب ان کے ہر سہ قویٰ مذکورہ (تینوں مذکورہ قوتیں) فاسد ہوگئے تو تحصیلِ علم و فہم کی اب کیا صورت ہوسکتی ہے؟''

عقل کے حصول کے لیے صحیح علم کی ضرورت: علم تین ذرائع سے حاصل ہوتا ہے:

1۔ علم سیکھنے کا پہلا ذریعہ؛ انسان کے پاس بات کو صحیح طور پر سننے کے لیے ''کان'' ہوں، جن سے کہی ہوئی بات سن کر سمجھی جائے۔ انسانیت کی رہنمائی کرنے والا ہادی اور رہنما جب سیدھے راستے کی رہنمائی کرتے ہوئے اپنی زبان سے بول کر وعظ و نصیحت کرے تو کانوں کے ذریعے سے اُسے پورے طور پر سن کر سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

2۔ علم سیکھنے کا دوسرا ذریعہ؛ ہدایت دینے والے معلم اور اُستاد کی سنی ہوئی بات کو اپنی ''زبان'' سے دُہرا کر یاد کرنا اور سمجھنا ہے۔ علم اپنی زبان سے دُہرایا نہ جائے تو بسا اوقات یاد نہیں رہتا۔ اچھے علم کا بار بار تذکرہ اور اُس کی تلاوت انسان کو عمل پر اُکساتی ہے۔ اُس سے اجتماعیت ترقی کرتی ہے۔ اسی لیے تلاوتِ قرآن حکیم اور ذکر واذکار دُہرانے کا حکم دیا گیا ہے۔ گونگا آدمی ان چیزوں سے محروم رہتا ہے۔ اسی لیے اُس کا فہم ناقص ہوتا ہے۔

3۔ تیسرا ذریعہ؛ آنکھ سے انسان کا اجتماعی اعمال کو مشاہدہ کرنا ہے۔ جب کھلی آنکھوں سے اپنے رہنماؤں کے طرزِ فکر و عمل کو دیکھ کر اُن کے طے کردہ اجتماعی اعمال کی پیروی کرتا ہے تو کامیابی کی منازل سے متعلق صحیح علم حاصل کرلیتا ہے۔

جب انسان ان تین ذرائع علم سے محروم اپنے آباؤاجداد کی اتباع کرے گا تو سوائے حیوانوں کی طرح تمدنی زندگی گزارنے کے اَور کچھ نہیں کرپائے گا۔ لہٰذا ایسے آباؤاجداد کی پیروی کی جانی چاہیے، جن کے پاس علم کے یہ تینوں ذرائع موجود ہیں۔

چناں چہ ملتِ ابراھیمیہ حنیفیہ کے سچے رہنماؤں؛ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام اور خاص طور پر امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اللہ کی طرف سے نازل کرنے والے حضرت جبریل علیہ السلام کے پیغامِ الٰہی کو اپنے کانوں سے سنا، اپنی زبان سے دُہرایا اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا، ایسے آباؤاجداد کی پیروی کرنے میں ہی کامیابی ہے۔

www.rahimia.org

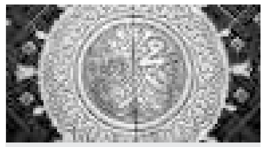

درسِ حدیث

از: مولانا ڈاکٹر محمد ناصر، جھنگ

مؤمنانہ فراست کا تقاضا

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ، قَالَ: ''لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَیْنِ''. (صحیح البخاری: 6133)

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہٗ نے نبی کریم ﷺ سے روایت کی کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مؤمن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا''۔)

حضرت مصعب بن عمیرؓ کے ایک بھائی ابوعزہ مسلمانوں کے خلاف تھے۔ وہ حضور ﷺ اور صحابہؓ کی توہین کیا کرتے تھے۔ یہ جنگِ بدر میں گرفتار کر کے حضورؐ کے پاس لائے گئے تو معافی طلب کی اور وعدہ کیا کہ آئندہ میں آپ کی برائی نہیں کروں گا۔ حضور ﷺ نے درگزر فرما دیا، لیکن آزاد ہوتے ہی یہ پھر ہجو (بُرائی) پر لگ گئے اور اُحد میں دوبارہ پکڑے گئے، اس وقت پھر عذر کیا، حضور ﷺ نے اس وقت یہ جملہ فرمایا: ''مؤمن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا''، تمھیں پہلے معاف کیا، مگر تم نے دوبارہ وہی حرکت کی۔ اَب تمھیں سزا دی جائے گی۔ اس حدیث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ ایمان انسان میں عقل و شعور پیدا کرتا ہے۔ گرد و پیش کے حالات سے آگاہ رہنا، گہرائی میں جا کر ان کے اسباب جاننے کی کوشش کرنا، نتائج پر غور کرنا، انسان دشمن یا دین دشمن قوتوں کی پہچان اور پرکھ رکھنا' یہ اونچے درجے کے اہلِ ایمان کے مزاج کا حصہ ہوتا ہے۔ صاحبِ فراست مؤمن ایک ہی بندے یا ایک ہی جماعت سے دو دفعہ نہیں ڈسا جا سکتا۔

تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دینی امور میں اہلِ ہدایت و اقتدا ہیں، لیکن حضور ﷺ نے جماعتِ صحابہؓ میں سے دُنیوی سیادت و قیادت کے لیے صرف ان اصحابؓ کو چنا جو معاشرتی مسائل کو زیادہ بہتر سمجھنے والے تھے اور معاشرے میں رہبر اور رہنما کے طور پر تسلیم کیے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جابجا خلفائے راشدینؓ کا اعتماد قائم کیا۔ حضورؐ کا یہ عمل شخصی پسند کے حوالے سے نہ تھا۔ آپؐ نے اُمت کے لیے ان کی رہبری کا انتخاب کیا جو دینی فہم کے ساتھ گرد و پیش کے حالات کا نسبتاً زیادہ فہم رکھتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ رومیوں اور فارسیوں کے مابین جنگ کی بابت ایک رائے قائم کرتے ہیں۔ گویا ان شخصیات کی سیاسی تربیت حضورؐ نے مکہ مکرمہ ہی میں کر دی تھی۔

اس حدیث کی روشنی میں حالات پر نظر رکھنا، صحیح حکمتِ عملی بنا کر جرأت و بہادری کے ساتھ ثابت قدم ہونا، مؤمن کی مؤمنانہ فراست کا لازمی تقاضا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک شخص کی چکنی چپڑی باتوں پر فرمایا بھئی! مؤمن کی فراست سے ڈرو وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے، تو یہ نورِ ایمان ہے۔ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ (32-السجدہ:5) (وہ آسمان سے لے کر زمین تک ہر کام کی تدبیر کرتا ہے) کی روشنی میں کائنات کا سارا نظام پروردگار چلا رہے ہیں تو ایمان کے ذریعے سے جس کا خدا سے تعلق قائم ہوتا ہے، اگر وہ خدا کی عنایت کے ساتھ اونچے درجے کا ہو گا، تو تدبیرِ الٰہی کے اس وصف سے وہ زیادہ استفادہ کرے گا۔

صحابہؓ کا ایمان افروز کردار

مولانا قاضی محمد یوسف، حسن ابدال

حضرت حارثہ بن نعمان انصاری خزرجی نجاری رضی اللہ عنہٗ

حضرت حارثہ بن نعمان انصاری خزرجی نجاری رضی اللہ عنہٗ ایک جلیل القدر، شریف الطبع، شاہ سوار، بہادر اور سخاوت کے پیکر صحابیٔ رسول تھے۔ امام نسائیؒ اور امام اصبہانیؒ نے آپؓ کو ''اصحابِ صفہ'' میں شامل کیا ہے۔ آپؓ کے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ گہرے تعلقات اور روابط تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ سفر میں ان کے خیمے اپنے خیمے کے قریب لگواتے تھے۔ حضرت حارثہؓ نے تمام غزوات بشمول بدر، اُحد اور احزاب میں شریک رہے۔ حضرت ابنِ قدامہؒ کہتے ہیں کہ: آپؓ عالم فاضل صحابہ کرام میں سے تھے۔

حضرت حارثہؓ نے اپنے کئی گھر رسول اللہ کی رہائش کے لیے وقف کر دیے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کی اس سخاوت پر خوشی کا اظہار کیا اور ان کے لیے برکت کی دعا کی۔ بعد ازاں حضرت فاطمۃ الزہرا، حضرت صفیہ اور حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہن کو بھی مکانات ہدیہ کیے۔ نیکی، فرماں برداری اور فضل و شرف نے آپؓ کو اہلِ جنت ہونے کا اعزاز بخشا۔ رسول اللہ ارشاد فرماتے ہیں: ''مَیں جنت میں داخل ہوا تو وہاں قرأت سنی، مَیں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ بتایا گیا: یہ حارثہ ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ نیکی تمھارے کام آئی''۔

حضرت حارثہؓ اپنی گھریلو زندگی میں ہر فرد کے حقوق کا خیال رکھتے تھے اور والدہ کا بہت زیادہ احترام کیا کرتے تھے۔ آپؓ کی والدہ کو نبوت کے گھرانے میں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ امام ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ حضرت حارثہؓ دیانت دار، نیک دل اور اپنی والدہ کے فرماں بردار تھے۔

حضرت حارثہؓ کی اولاد میں سے ان کے بیٹے حضرت عبداللہؓ نے بیعتِ رضوان میں شمولیت اختیار کی اور ان کی بیٹی حضرت اُمِ ہشامؓ بھی صحابیات میں سے ہیں۔ آپؓ کی نسل میں سے ابوالرجال محمدؒ، عالمہ فاضلہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن بن حارثہ کے فرزند ہیں۔ ان سے مروی احادیث کتبِ ستہ میں محدثین نے نقل کی ہیں۔

حضرت حارثہؓ نے خلافتِ راشدہ کے دور میں بھی ہر میدان میں نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔ آپؓ انسان دوست اور مسکین نواز تھے۔ غریبوں کی ہمیشہ خبرگیری کرتے تھے۔ آخری عمر میں آپؓ کی بینائی ختم ہو گئی تھی، اس کے باوجود مساکین کی خبرگیری میں کمی نہ آنے دی۔ اس حالت میں بھی اپنی نشست سے دروازے تک رسی بندھی ہوئی تھی، کھجور کا ٹوکرا پاس رکھتے تھے اور ہر آنے والے ضرورت مند کو اپنے ہاتھ سے کھجوریں عطا کرتے تھے۔ آپؓ کے اہلِ خانہ کہتے کہ ہم آپؓ کی جگہ کافی ہیں، کیوں تکلیف کرتے ہیں؟ تو آپؓ نے فرماتے کہ: ''میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ: ''مسکین کو عطیہ دینے والا بُری موت سے بچ جاتا ہے''۔ امام ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں کہ: حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ خلافت میں حضرت حارثہؓ نے ۵۱ ہجری میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔

www.rahimia.org

قومی بحران سے قومی تشکیلِ نو تک

عدل اور عوامی اعتماد پر قائم اجتماعی نظام کی ناگزیر ضرورت

ستمبر کا مہینہ خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور اور اس سے وابستہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے فکری و تربیتی حلقے کے لیے ایک خاص تاریخی اور جذباتی نسبت رکھتا ہے۔ اسی ماہ ادارہ رحیمیہ کے بانی، سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور کے عظیم داعی اور اس کے مسند نشین رابع، نیز عصرِ حاضر میں فکرِ ولی اللّٰہی کے ترجمان حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کا وصال محض ایک بزرگ، عالم یا روحانی شخصیت کا دنیا سے اٹھ جانا نہیں تھا، بلکہ ایک ایسی شخصیت کی جدائی تھی، جس نے اپنی پوری زندگی قرآنِ حکیم کے اجتماعی پیغام کی تفہیم، فکرِ ولی اللّٰہی کی تجدید، سماجی شعور کی بیداری اور ایک صالح، عادلانہ و انسان دوست اجتماعی نظام کی تشکیل کے لیے وقف کیے رکھی۔

آج جب ہم ان کی یاد کے مہینے میں پاکستان کے قومی حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ سوال مزید اہم ہو جاتا ہے کہ جس سیاسی، معاشی اور سماجی بحران کی نشان دہی ہمارے اکابر کئی دہائیوں سے کرتے آ رہے تھے، کیا ہم نے اس کے بنیادی اسباب کو سمجھا؟ اور کیا تقریباً آٹھ دہائیوں کی قومی زندگی کے بعد بھی ہم محض افراد، جماعتوں، حکومتوں اور منصوبوں کی تبدیلی ہی کو مسائل کا حل سمجھ رہے ہیں، یا اب وقت آ گیا ہے کہ نظام اور اس کی فکری بنیادوں پر بھی سنجیدہ غور کیا جائے؟

برعظیم کے مسلمانوں نے برطانوی سامراج کے خلاف صبر آزما ایک طویل اور قربانیوں سے بھرپور سیاسی، علمی اور عوامی جدوجہد کے بعد آزادی حاصل کی۔ اس کے نتیجے میں 1947ء میں پاکستان وجود میں آیا۔ تاہم آزادی کے اُناسی برس مکمل ہونے کے باوجود ایک بنیادی سوال آج بھی ہمارے سامنے موجود ہے: کیا جغرافیائی آزادی کے ساتھ ہم اس نوآبادیاتی نظامِ حکومت، معاشی ڈھانچے اور انتظامی ذہنیت سے بھی آزاد ہو سکے جو برطانوی استعمار نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے قائم کی تھی؟

استعمار کا نظام عوام کو بااختیار بنانے کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ ان پر حکمرانی کرنے کے لیے تشکیل دیا جاتا ہے۔ چناں چہ برطانوی استعماری نظام میں انتظامیہ کا بنیادی مزاج عوامی خدمت کے بجائے جابرانہ کنٹرول تھا؛ معاشی نظام کا مقصد مقامی آبادی کی خوش حالی کے بجائے وسائل کا ارتکاز اور ان کی اپنے ملک کے لیے برآمد تھا؛ اور سیاسی بندوبست کا مقصد حقیقی عوامی شرکت کے بجائے اقتدار کے لیے قابلِ اعتماد آلۂ کار طبقات پیدا کرنا تھا۔ آزادی کے بعد ریاست کا پرچم بدل گیا، حکمرانوں کے نام بدل گئے اور آئینی و سیاسی اداروں کے عنوانات و عمارات بھی وجود میں آئے، لیکن ریاست اور شہری کے تعلق کی بہت سی بنیادی ساختیں اسی تاریخی نوآبادیاتی ورثے کے زیر اثر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری قومی تاریخ بار بار سیاسی عدمِ استحکام، آئینی بحران، مرکز و صوبہ کشمکش، معاشی ناہمواری و تنگ دستی، سماجی بے امنی و گروہی دہشت گردی اور ادارہ جاتی تصادم کے دائروں میں گھومتی دکھائی دیتی ہے۔

پاکستان میں عمومی سیاسی مباحث کا بڑا حصہ شخصیات کے گرد گھومتا ہے۔ کبھی کسی سیاسی جماعت کو تمام مسائل کی جڑ قرار دیا جاتا ہے، پھر ستم یہ کہ اسے ایک موقع پر حکومت بھی سونپ دی جاتی ہے؛ کبھی کسی حکمران کو نجات دہندہ سمجھ لیا جاتا ہے اور پھر اس کا دیس نکالا ہو جاتا ہے یا اسے تختہ دار پر پہنچا دیا جاتا ہے؛ کبھی کسی ایک ادارے کو تمام خرابیوں کا ذمہ دار ٹھہرا دیا جاتا ہے، اور پھر اسے ملک کے تحفظ کا کریڈٹ اور تمغہ جمہوریت دے دیا جاتا ہے۔ یقیناً افراد، جماعتیں اور ادارے اپنی ذمہ داریوں سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ غلط فیصلوں کا احتساب اور آئینی حدود کی پابندی ہر مہذب معاشرے کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اگر آٹھ دہائیوں کے دوران مختلف سیاسی جماعتیں، مختلف حکمران اور مختلف پالیسیاں آزمانے کے باوجود مسائل اپنی بنیادی صورت میں موجود رہیں تو سوال افراد سے آگے بڑھ کر نظام کی ساخت تک پہنچ جاتا ہے۔

معاشی وسائل چند طبقات میں مرتکز ہوں، پیداواری معیشت کمزور ہو، ریاست اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے مسلسل قرض کی محتاج ہو، عام آدمی بالواسطہ ٹیکسوں کے بوجھ تلے کراہ رہا ہو، تعلیم اور صحت جیسی بنیادی ضروریات بھی منڈی کی قوتوں کے حوالے ہوتی چلی جائیں، اور نوجوان اپنی صلاحیتیں اپنے وطن میں بروئے کار لانے کے مواقع نہ پا کر بیرونِ ملک کامیابی کی تلاش میں اپنی تمام تر پونجی، حتیٰ کہ اپنی جان سے ہاتھ دھونے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو یہ محض کسی حکومتی ڈھانچے کی ناکامی نہیں رہتی؛ یہ اس پورے معاشی و سیاسی بندوبست کے جائزے کا تقاضا کرتی ہے جو بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اس ملک پر تھوپا گیا، جس کے تحت ملک کے حکمرانِ اعظم کو تاجِ برطانیہ کی وفاداری کا حلف اٹھانا پڑتا تھا۔

کسی بھی ریاست کی اصل طاقت صرف اس کے انتظامی ادارے، قوانین اور طاقت کے وسائل نہیں ہوتے؛ اس کی سب سے بڑی طاقت عوام کا اعتماد ہوتا ہے۔ عوام اس وقت ریاست پر اعتماد کرتے ہیں جب انھیں یقین ہو کہ قانون سب کے لیے یکساں ہے، قومی وسائل کی تقسیم منصفانہ ہے، ان کی آواز فیصلہ سازی میں مؤثر ہے، ان کے بنیادی حقوق محفوظ ہیں اور ریاستی ادارے اپنے متعین آئینی دائرے میں رہ کر اجتماعی مفاد کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس جب شہری یہ محسوس کرنے لگے کہ طاقت ور اور کمزور کے لیے قانون کا معیار مختلف ہے، قومی دولت اور مواقع تک رسائی چند مخصوص طبقات تک محدود ہے اور عام آدمی کی زندگی کے بنیادی فیصلوں میں اس کی شرکت مفقود ہوتی جا رہی ہے تو ریاست اور شہری کے درمیان اعتماد کی وہ ڈور الجھ کر رہ جاتی ہے جو کسی بھی قومی اجتماعیت کی بنیاد ہوتی ہے۔

پاکستان کو آج اس اعتماد کی تعمیرِ نو کی شدید ضرورت ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والی بے چینی کو بھی اسی وسیع تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

www.rahimia.org

بلوچستان ہو، خیبر پختونخوا ہو، آزاد کشمیر ہو، گلگت بلتستان ہو یا ملک کا کوئی دوسرا خطہ، عوامی اضطراب کو صرف انتظامی یا امن وامان کے مقامی مسئلے کے طور پر دیکھنا کافی نہیں۔ جہاں وسائل کی تقسیم، روزگار، بجلی، ٹیکس، مقامی اختیار، سیاسی نمائندگی یا بنیادی شہری سہولیات سے متعلق سوالات اٹھیں، وہاں ریاست کی پہلی ترجیح مکالمہ، سیاسی تدبر اور منصفانہ حل ہونا چاہیے۔ طاقت وقتی طور پر قبرستان جیسی خاموشی تو پیدا کرسکتی ہے، لیکن پائیدار قومی وحدت صرف انصاف پیدا کرتا ہے۔ برصغیر کی اپنی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ سیاسی مسائل کا مستقل حل محض انتظامی طاقت سے نہیں نکلتا۔ مسائل کے سیاسی، معاشی اور سماجی اسباب کو سمجھنا اور انھیں انصاف کے اصول پر حل کرنا ہی ریاستوں کو مضبوط کرتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ملکی و بین الاقوامی حالات پر گہری نظر رکھنے والی صاحبِ بصیرت و عزیمت شخصیت حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کی تجزیاتی فکر اور شعوری مزاحمت کی جدوجہد ہمارے لیے غیر معمولی اہمیت اختیار کرجاتی ہے اور اس سے رہنمائی حاصل کی جانی چاہیے۔

حضرت رائے پوریؒ نے دین کو محض انفرادی عبادات، رسوم یا محدود مذہبی دائرے میں نہیں دیکھا۔ ان کے نزدیک قرآنِ حکیم انسان کی انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ انسانی اجتماعیت کی تشکیل کا بھی سرچشمہ ہے۔ اسی لیے انھوں نے حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، حضرت امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور اپنے اکابرِ رائے پور حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رائے پوریؒ کی فکری روایت کو عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق سمجھنے اور سمجھانے پر زور دیا۔ ان کی جدوجہد کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی پسماندگی کو محض اخلاقی کمزوری یا انفرادی بے عملی کے زاویے سے دیکھنا کافی نہیں۔ اس کے پس منظر میں سیاسی غلامی، معاشی استحصال، غیر منصفانہ تقسیمِ دولت، طبقاتی تفاوت اور اجتماعی شعور کی کمزوری کا بھی شعوری ادراک کرنا ہوگا۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر کا ایک نمایاں پہلو انسانی معاشرے میں اجتماعی عدل کے قیام کی ناگزیریت کو قرار واقعی اہمیت دینا ہے۔ انھوں نے انسانی سماج، معیشت، تقسیمِ دولت اور ریاست کے مسائل کو دین کے اجتماعی مقاصد سے مربوط کرکے دیکھا۔ اس فکر کی روشنی میں وہ معاشرہ صحت مند نہیں رہ سکتا جس میں ایک طرف دولت اور وسائل محدود طبقات میں مرتکز ہوتے چلے جائیں اور دوسری طرف معاشرے کی بڑی اکثریت اپنی بنیادی ضروریات کے حصول کے لیے مسلسل لڑھکتی چلی جائے۔

پاکستان کے موجودہ معاشی بحران کو بھی اسی اصول کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سوال صرف یہ نہیں کہ زرمبادلہ کے ذخائر کتنے ہیں، شرحِ نمو کیا ہے یا بجٹ کا خسارہ کتنا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ قومی معیشت کے منصوبے کو انسانی مفاد کے لیے پروان چڑھایا جائے یا انسان کو معیشت کے بے رحم مشینی اعداد وشمار کے بھینٹ چڑھا دیا جائے؟

اگر معاشی ترقی کے اعداد وشمار بہتر ہوں لیکن عام شہری کو تعلیم، علاج، رہائش، روزگار اور باعزت زندگی میسر نہ ہو تو ایسی ترقی اپنی اجتماعی معنویت کھو دیتی ہے۔ پاکستان کو آج کسی نئے نعرے سے زیادہ ایک عادلانہ قومی اتفاق اور منصفانہ عمرانی معاہدے کی ضرورت ہے۔ ایسا معاہدہ جو آئین میں درج دفعات کے حذف واضافے کا مجموعہ نہ ہو بلکہ ریاستی اداروں اور شہریوں کے درمیان حقیقی میثاق بنے؛ قانون کی بالادستی کا عنوان کسی ایک طبقے یا سیاسی ضرورت کی تکمیل کے لیے نہ ہو؛ قومی وسائل کو عوامی امانت سمجھا جائے؛ وفاق اور اکائیوں کے تعلق کو باہمی احترام، انصاف اور زمینی حقائق کی بنیاد پر استوار کیا جائے؛ اور سیاسی اختلاف کو ذاتی دشمنی اور شخصی تصادم کے بجائے جمہوری معاشرے کا فطری حصہ سمجھا جائے۔ اسی طرح معیشت کا رخ محض سرمایہ کے ارتکاز سے ہٹا کر پیداوار، محنت، روزگار اور منصفانہ تقسیمِ دولت کی طرف موڑا جائے اور تعلیم کو باشعور، ذمہ دار اور اجتماعی شعور رکھنے والے سماج کی تشکیل کا وسیلہ بنانے کے لیے قومی تعلیمی اداروں کو متاعِ تجارت کی بجائے اپنے قومی ورثے کے طور پر محفوظ رکھا جائے اور ترقی دی جائے۔

ہمیں اپنی قومی تاریخ سے یہ سبق حاصل کرنا چاہیے کہ طاقت کا غیر دانش مندانہ استعمال مسائل کو وقتی طور پر دبا تو سکتا ہے، لیکن ختم نہیں کرسکتا۔ قومی وحدت بندوق، حکم یا خوف سے نہیں بنتی۔ وہ مشترکہ مفاد، انصاف اور اعتماد سے تشکیل پاتی ہے۔ ایک بلوچ، سندھی، پشتون، پنجابی، کشمیری، گلگتی یا بلتی شہری کو پاکستان کی وحدت سے اس لیے وابستہ ہونا چاہیے کہ اسے اس اجتماعیت میں اپنی عزت، حقوق اور مستقبل محفوظ دکھائی دے۔ یہی مضبوط وفاق اور پائیدار قومی وحدت کا اصول ہے۔

ماہ ستمبر میں حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کے وصال کی یاد ہمیں محض ماضی کی ایک عظیم شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی یاد دہانی نہیں کرواتی، بلکہ ہمارے سامنے ایک سوال بھی رکھتی ہے: جس اجتماعی شعور، عدلِ اجتماعی اور نظام کی تبدیلی کی ضرورت پر انھوں نے اپنی پوری زندگی صرف کی، آج ہمیں اس جدوجہد کو کس طرح درست سمت میں آگے لے کر چلنا ہے؟ اکابر کی حقیقی یادگار صرف ان کے تذکرے، مجالس، اقوالِ زریں اور تصاویر نہیں ہوتیں۔ ان کی اصل یادگار ان کے فکر، مقصد اور جدوجہد کو اپنے عہد کے مسائل سے مربوط کرنا ہوتی ہے۔

آج حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کی لگ بھگ پون صدی کی فکری و عملی جدوجہد کا تقاضا یہی ہے کہ ہم پاکستان کے مسائل کو فرقہ وارانہ، جماعتی اور شخصی تعصّبات سے بلند ہو کر سمجھیں۔ سیاسی وابستگیوں سے اوپر اٹھ کر اجتماعی مفاد کو دیکھیں۔ طاقت ور اور کمزور دونوں کے لیے ایک ہی معیارِ انصاف کا مطالبہ کریں۔ معاشی نظام کو انسانی ضروریات کے تابع بنانے کی جدوجہد کریں اور نوجوان نسل میں ایسا شعور پیدا کریں جو محض حالات پر احتجاج نہ کرے بلکہ ان کے اسباب کو سمجھے اور ان کی اصلاح کے لیے منظّم، پُرامن اور حکیمانہ اجتماعی کردار ادا کرے۔

بقیہ: صفحہ: 12 پر

www.rahimia.org

''نفس'' سے متعلق ''مقامات'' (4)

مترجم: مفتی عبدالخالق آزادرائے پوری

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حُجّةُ اللّٰہِ البالِغہ'' میں فرماتے ہیں:

(خیالات کے درمیان مزاحمت اور ٹکراؤ کی مثال)

نبی اکرم ﷺ نے دل میں پیدا ہونے والے دو خیالوں کے درمیان ٹکراؤ، حقانی خیال کو باطل خیال پر غالب کرنے اور نفس کو حقانی خیال کے تابع کرنے کو بیان کیا ہے، یہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان کا نفس نورِ ایمانی سے منور عقل کے آداب سیکھ کر اُن پر مطمئن ہوجاتا ہے اور (یہ بھی بیان فرمایا کہ:) جب نفس نافرمان اور منکر ہوتا ہے تو اُن آداب سے بغاوت اور اس کا انکار کرتا ہے تو ایسی حالت کو رسول اللہ ﷺ نے بخل اور سخاوت کے ٹکراؤ کے مسئلے میں اس مثال سے بیان فرمایا کہ جس میں دو لوہے کی زرہیں ہیں، ایک کھلی ہے اور دوسری تنگ ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: ''بخیل اور صدقہ دینے والے کی مثال اُن دو آدمیوں کی سی ہے، جن پر لوہے کے جبے (زِرہیں) ہیں، جس سے وہ اپنے ہاتھ، سینہ اور حلق تک پہنچنے میں مشکل محسوس کرتے ہیں۔ چناں چہ صدقہ دینے والا جب بھی صدقہ کرتا ہے تو اس کے زِرہ میں کشادگی ہوجاتی ہے (اور وہ اس کی انگلیوں تک بڑھ جاتا ہے اور قدم کے نشانات کو ڈھک لیتا ہے) اور بخیل جب بھی کبھی صدقہ کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی زِرہ اسے اور چمٹ جاتی ہے اور اُس کی ہر کڑی اپنی جگہ پر جم جاتی ہے''۔ (البخاری:5797)

مَیں کہتا ہوں کہ: وہ آدمی جس کا نفس جبلی طور پر یا اپنی محنت اور کسب سے نورِ ایمانی پر مطمئن ہوگیا تو حقانی خیال اُس کے نفس کو تھامے رکھتا ہے اور پہلے مرحلے میں ہی اُس پر قابو پالیتا ہے۔ وہ آدمی جس کا نفس حقانی خیال کی نافرمانی کرتا ہے اور انکار کرتا ہے تو حقانی خیال اُس پر اثر نہیں کرتا، بلکہ اُس سے دور ہوجاتا ہے۔

(نورِ ایمانی سے عقل کا منور ہونا اور اس کا نفس پر فیضان ہونا)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآنِ عظیم میں نورِ ایمانی سے عقل کے منور ہونے اور اُس نور کے نفس پر فیضان کو کچھ اس طرح بیان فرمایا ہے کہ: ''بے شک جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں، جب انھیں کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آتا ہے تو وہ (اللہ کی) یاد میں لگ جاتے ہیں، پھر اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں''۔ (7-الاعراف: 201) مَیں کہتا ہوں کہ: شیطان انسان کے باطن میں شہوتِ نفس کے سوراخ کے راستے سے جھانکتا ہے۔ پس اُس میں نافرمانی کا داعیہ اور خیال پیدا کرتا ہے، لیکن جب انسان اپنے رب کی جلالتِ شان کو یاد کرتا ہے اور اُس کے سامنے خشوع کا اظہار کرتا ہے تو اس سے انسان کی عقل میں ایک نور پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ نور ہی بصیرت ہے۔ پھر یہ نورِ بصیرت قلب اور نفس کی طرف آتا ہے تو اس شیطانی خیال کو دفع کردیتا ہے اور شیطان کو بھگا دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو! وہ لوگ کہ جب انھیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: ''إِنَّا لِلّٰهِ الخ''؛ ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت، اور یہی ہدایت پانے والے ہیں''۔ (2-البقرہ: 155 تا 157)

مَیں کہتا ہوں کہ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''إِنَّا لِلّٰهِ'' میں حقانی خیال کے نازل ہونے کی طرف اشارہ ہے اور اُس کے قول: ''صَلَوٰتٌ مِن..'' (رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت) میں اُن برکات کی طرف اشارہ ہے جو صبر کا پھل ہے کہ اُس سے نفس میں نورانیت پیدا ہوتی ہے اور اُس کی عالمِ ملکوت سے مشابہت پیدا ہوجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: ''اللہ کے حکم کے بغیر کوئی مصیبت بھی نہیں آتی اور جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے''۔ (63-تغابن: 11) مَیں کہتا ہوں کہ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کا قول ''اللہ کے حکم'' سے تقدیر کی معرفت کی طرف اشارہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا قول ''اللہ پر ایمان رکھتا ہے'' سے حقانی خیال کا ''عقل'' سے قلب اور نفس کی طرف آنے کا اشارہ ہے۔

(''نفس'' سے متعلق ''احوال'')

1۔ ''غَیبت'': وہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی شہوات سے غائب ہوجائے، جیسا کہ حضرت عامر بن عبداللہ (بن زبیر بن عوامؓ) نے ارشاد فرمایا تھا کہ: ''مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا کہ میں نے عورت دیکھی ہے یا دیوار دیکھی ہے''۔ اسی طرح (مشہور فقیہ) حضرت امام (عبدالرحمٰن بن عمرو) اَوزاعیؒ سے پوچھا گیا کہ: ہم نے بازار میں آپ کی نیلی آنکھوں والی لونڈی دیکھی ہے تو انھوں نے فرمایا کہ: ''کیا وہ نیلی آنکھوں والی ہے؟''

2۔ ''مَحق''؛ نفس کے احوال میں سے ''مَحق'' بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک مدت تک کھانے پینے سے بغیر عادت کے غائب رہنا۔ اس لیے کہ اُس کا نفس عقل کی جانب میلان رکھتا ہے اور عقل اللہ کے نور سے بھری ہوئی ہے۔

اس سے زیادہ بڑا اور اعلیٰ مقام یہ ہے کہ اللہ کے نور کا نفس پر نازل ہو کر کھانے پینے کے قائم مقام بن جانا۔ یہی رسول اللہ ﷺ کے اس اشارے کا مطلب ہے کہ: ''میں تم جیسا نہیں ہوں، میں رات گزارتا ہوں اور میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے''۔ (البخاری: 7299)

(اکثر آیات واحادیث میں احوال ومقامات کا قلب کی طرف نسبت کرنا)

علمی طور پر جاننا چاہیے کہ انسان کا ''قلب''؛ ''عقل'' اور ''نفس'' کے درمیان واقع ہوا ہے۔ بسا اوقات ان تینوں لطائف کو نظرانداز کرتے ہوئے تمام مقامات یا اکثر مقامات کو دل کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے اور اس استعمال پر بہت سی آیات اور احادیث وارد ہوئی ہیں۔ اس نکتے سے کبھی غافل نہ ہونا۔

(اچھے اور بُرے اَخلاق)

جاننا چاہیے کہ نفسِ بہیمی اور درندہ صفت قلب سے پیدا ہونے والے ہر قسم کے خیالات کو جب نورِ ایمانی سے دور کیا جاتا ہے تو اُس کا ایک نام ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان میں سے ہر ایک کے نام اور اُن کے اَوصاف کو بڑے اہتمام سے بیان فرمایا ہے۔ پس جب عقل کو حقانی خیالات پیدا کرنے کا ملکہ حاصل ہوجائے اور نفس میں عقل کے اُن خیالات کو قبول کرنے کا ملکہ پیدا ہوجائے تو اسے ''مقام'' کہتے ہیں۔ (بقیہ: صفحہ 12 پر)

www.rahimia.org

خطبات و بیانات

رپورٹ: سیّدنفیس مبارک ہمدانی، لاہور

دینِ اسلام کا مطمحِ نظر؛ انسانی سماج

7/ اگست 2026ء کو حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزادرائے پوری مدظلہ نے ادارہ رحیمیہ لاہور میں خطبہ جمعہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''معزز دوستو! قرآن حکیم انسانی معاشروں کا تجزیہ کرتا ہے، گزشتہ قوموں کے واقعات، سماجی تشکیل یا سماج میں فساد کے تناظر میں گفتگو کر کے واضح کرتا ہے کہ انسانیت بغیر اجتماعیت کے نہیں رہ سکتی۔ جب وہ اجتماعیت قائم کرتی ہے، اسی سے گھر بنتا ہے، محلّہ بنتا ہے، شہر بنتا ہے، ملک اور ریاست وجود میں آتی ہے اور اقوام عالم کے درمیان بین الاقوامی تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ یہ انسانی سماج، دین اسلام کا مطمحِ نظر ہے کہ انسانی سماج کو اپنا موضوع بحث بنایا جائے تاکہ انسان دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ہو۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ دین اسلام کی تمام عبادات اور اعمال کے دو بڑے بنیادی مقاصد ہیں۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی تہذیب کرے، گناہوں، غلطیوں، ظلم اور زیادتی، بداخلاقیوں سے اپنے آپ کو پاک کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ سے سچا تعلق قائم کرے۔ دوسرے یہ کہ انسانی سوسائٹی کی جتنی بھی اجتماعی سطحیں ہیں، خواہ اس کا تعلق گھریلو نظام سے ہو، یا کسی بھی سطح کی اجتماعیت سے ہو، وہ تعلق ایک درست سسٹم کے طور پر مربوط ہونا چاہیے۔ اور تمام وہ تعلقات مل کر ایک ریاست اور شہر اور مملکت کی سطح پر ایک ایسے نظام کی صورت میں ڈھلیں کہ تمام انسانوں کے جانی، مالی اور عزت و وقار سے متعلق حقوق پورے ہوں۔ اس کے لیے شاہ صاحبؒ نے ''نظامُ المدینہ'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ مملکت کا نظم ونسق، ریاست اور قوم کا نظم ونسق درست خطوط پر استوار ہو اور انسانیت ایک ایسی لڑی میں پروئی جائے کہ ان میں سے ہر طرح کا انتشار، فساد، ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کا عمل ختم ہو جائے اور وہ سب ایک ڈسپلن میں آجائیں۔ ڈسپلن کے اس قیام کو ہی ''نظام'' کہتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ریاست اور مملکت ایک لیگل پرسن ہوتا ہے اور جیسے ایک شخص صحت مند بھی ہوتا ہے، بیمار بھی ہوتا ہے، اسی طرح ایک ریاست بیمار بھی ہوسکتی ہے، صحت مند بھی ہوسکتی ہے، ترقی یافتہ بھی ہوسکتی ہے، زوال پذیر اور فسادزدہ بھی ہوسکتی ہے۔ سیاست نام ہے کسی ریاست کے امراض کو پہچاننا اور اس کی حالت صحت سے واقفیت حاصل کرنا کہ کس درجے میں صحت ہے اور کس درجے میں مرض ہے۔ اسی لیے نظام سیاست اور حکومت اور نظام مملکت اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ پوری سوسائٹی کے اس بنیادی ربط اور سسٹم کو محفوظ رکھے جو ان کی حالتِ صحت کو یقینی بنائے۔ سیاست کا بنیادی موضوع؛ کسی شے کو نقص سے نکال کر کمال کی طرف پہنچانا اور کسی مملکت کے نظام سے بحث کرنا ہے۔ یہ کتاب مقدس قرآن حکیم کا ایک اہم ترین موضوع ہے''۔

انبیا علیہم السلام کی جدوجہد کا محور؛ نظامُ المدینہ

حضرت آزادرائے پوری مدظلہ نے مزید فرمایا:

''قرآن حکیم کا موضوع 'نظام المدینہ' ہے۔ اس لیے انسانی سماج میں انبیا علیہم السلام کے نزدیک سسٹم اور نظام بنیادی موضوعِ بحث رہا ہے۔ قرآن حکیم نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر رسول اللہ ﷺ تک انبیا علیہم السلام کے جو واقعات بیان کیے ہیں، ان کا تعلق سماج کی تشکیل اور اس کے نظام سے ہے۔ فرعونی نظام ہو، نمرودی نظام ہو، جالوتی نظام ہو، یہودی نظام ہو یا عیسائی نظام، ان تمام کا قرآن حکیم نے بڑی وضاحت کے ساتھ فساد في الأرض اور اصلاح في الأرض کے تناظر میں جائزہ لیا ہے کہ ریاست میں کہاں اصلاح ہے اور کہاں فساد؟ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ موسوی جدوجہد، داؤدی جدوجہد، عیسوی جدوجہد، اصلاح في الأرض یا اصلاح في المدينہ کی تھی، جب کہ فرعون وقارون اور ہامان وجالوت وغیرہ کی جدوجہد فساد کی تھی۔

قرآن حکیم میں نظام المدینہ اور سیاسی نظام پر بار بار گفتگو کی گئی ہے۔ احکاماتِ شرعیہ کی تو چند آیات ہیں، اصولِ فقہ کے محققین نے صرف پانچ سو آیات کے بارے میں کہا ہے کہ یہ احکام سے متعلق ہیں، باقی تمام آیات اُن واقعات اور قصص پر مشتمل ہیں، جو انسانی معاشروں کے تجزیے پر مشتمل ہیں، ان میں بحث ہی سسٹم سے کی گئی ہے۔ اب یہاں احکامات میں سے جو عبادات ہیں، وہ تو ہمارے ہاں عام طور پر پیشِ نظر رہتے ہیں، لیکن وہ واقعات جن کے تناظر میں قرآن نے عبرت سکھائی ہے۔ قرآن نے کہا: ''ان قصوں میں عقل مندوں کے لیے بڑی عبرت ہے''۔ (12-یوسف: 111) یہ عبرت کیا ہے؟ کہ اپنے گردوپیش کے معاشرے کو اس کے تناظر میں جانچنا اور پرکھنا۔

گویا نظام پر بحث' دین اسلام کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔ جب تک نظام کی حقیقت معلوم نہ ہو، تو بحث بھی درست رُخ پر نہیں ہوسکتی۔ کوئی آدمی مسلمان ہو، قرآن کی تلاوت کرے، نبی اکرم ﷺ پر ایمان لائے، لیکن اپنے ملک کے سیاسی وسماجی نظام پر بحث نہ کرے یا ان آیات کے تناظر میں اپنے دور کی سیاست، نظام حکومت اور اس سے متعلق امور کو زیر بحث نہ لائے، اس کا ایمان حلق سے اوپر اوپر رسمی اور ناقص ہے۔

نظام لغت میں اس دھاگے کو کہتے ہیں جو مختلف اور منتشر چیزوں کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ اگر وہ ہیرے جواہرات ہوں تو وہ نظام کا دھاگہ ان تمام کو ایک ہار میں پرو دیتا ہے۔ تسبیح بنانے کا بھی اصول اور ضابطہ ہے۔ اگر اس کا امام یا لاکٹ بیچ میں ڈالنا ہے تو جائزہ لینا ہوگا کہ کتنے دانے اِدھر ہوں گے، کتنے دانے اُدھر ہوں گے، تاکہ دیکھنے میں وہ تسبیح خوب صورت لگے۔ بے ڈھنگا اور بے تکا ہار نہیں بنتا، نہ ہی بے تکی اور بے ڈھنگی تسبیح پسند کی جاتی ہے۔ اس کا بھی ایک امام ہوتا ہے اور اس کے دانے بھی ترتیب وار ہوتے ہیں۔ اسی طرح نظامِ مملکت اور نظامِ ریاست ہوتا ہے، جس میں تمام انسان برابر طور پر پروئے ہوئے ہوتے ہیں''۔

www.rahimia.org

مقصدِ بعثتِ نبوی ﷺ؛
فرد سے لے کر اقوام تک کی تہذیب

حضرت آزادرائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

''نظام کا تعلق عملی چیزوں سے ہوتا ہے کہ عملی کردار کیا ہو۔ نکاح کے نتیجے میں جو خاندان کا عملی نظام بنے گا، اسے ''تدبیرِ منزل'' کہتے ہیں اور جو کسی ریاست کی تشکیل میں عملی کردار اور ذمہ داریاں بنیں گی، حکومت کی اور عوام کی، اسے ''نظامِ مدینہ'' کہتے ہیں۔ یہ نظام فرد کی ذاتی شخصیت سے لے کر بین الاقوامی دائرے تک، ان تمام منتشر اور مختلف چیزوں کو ایک جگہ پر پرو دیتا ہے۔ انسانی زندگی میں بالاتر نظام، زیریں نظاموں پر اپنا کنٹرول رکھتا ہے۔ جیسے انسان کے اندر اس کے دل کا نظام ہے، جو بادشاہ اور حکمران ہے اور پورے جسم کے اعضا میں خون کی سپلائی دیتا ہے، ان کی ضروریات پوری کرتا ہے، لیکن اس کے زیریں نظام بھی ہیں، جیسے نظامِ انہضام، گردوں کا نظام، جگر اور معدے کا نظام وغیرہ ہیں۔ یہ تمام زیریں نظام اس مرکزی نظام سے جڑے ہوئے ہیں۔ نظام کا کام یہ ہے کہ کسی عضو کو خرابی لاحق ہو تو اس خرابی کو دور کرنے کی طرف متوجہ ہو۔

اس لیے نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے بارے میں فرمایا کہ: مؤمن جب اپنی اجتماعی زندگی یا ریاستی زندگی میں اپنی اجتماعی شناخت قائم کر لیتے ہیں تو ایک انسانی جسم کی طرح ہیں۔ اس جسدِ واحد کا بھی ایک نظام ہے۔ اس ریاست کا ایک سربراہِ حکومت ہے اور اس کے نیچے بہت سارے زیریں نظام ہیں: معاشی نظام، سیاسی نظام، قانون اور آئین کے لیے پارلیمانی نظام، عدالتی نظام، تعلیمی نظام اور دیگر بے شمار نظام۔ ان تمام نظاموں کو مربوط کریں گے تو ایک ریاستی تشخص، قانونی اتھارٹی اور نظام بن جاتا ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے قرآن حکیم کی تعلیم اور مسلمانوں کے نظام کا خلاصہ نکال کر واضح کیا کہ ارتفاقِ اول کی سطح پر بنیادی افکار اور نظریات کیا ہیں، گھر کے نظام میں ملتِ محمدیہ کے ضابطے کی روشنی میں کون کون سے امور پورے کیے جانے ہیں، ارتفاقِ ثانی کے دائرے میں بنیادی معاملات کیا ہیں، اسی طرح ارتفاقِ ثالث قومی نظام کی خصوصیات کیا ہیں اور پھر بین الاقوامی نظام میں تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔

شاہ صاحب کہتے ہیں کہ نظریات مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن ہر ملت اپنا نظام بناتی ہے۔ ملت نجامین اپنے نظام کو علم نجوم کی بنیاد پر، ملت طبیعیین طبیعیاتی قوانین کی بنیاد پر، ملت مجوس عقلی اصول پر، جبکہ ملت محمدیہ یا ابراہیمی ملت ذاتِ باری تعالیٰ، ملاءِ اعلیٰ اور ملائکہ کی تعلیم، جو قرآن کی صورت میں جامع ایڈیشن کے طور پر بن کر آ چکی ہے، کی بنیاد پر چاروں ارتفاقات بناتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان چاروں ارتفاقات کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکامات اور ملت حنیفیہ کی بنیاد پر استوار کیا۔ آپ ﷺ بین الاقوامی نظام قائم کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اور بین الاقوامی نظام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک قومی ریاستی نظام ٹھیک نہ ہو، ریاست کے اندر خاندانی نظام ٹھیک نہ ہو اور خاندانی نظام ٹھیک نہیں ہو سکتا جب تک افراد کی تہذیب، تہذیبِ نفس موجود نہ ہو''۔

خیر کے فقدان
سے دینی نظام کا زوال

حضرت آزادرائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

''آپ ﷺ نے 23 سالہ دورِ نبوت میں چاروں کام (فرد، خاندان، ریاست اور بین الاقوامی نظام کی اصلاح) بہ یک وقت انجام دیئے اور 23 سال میں یہ کام مکمل کر کے اپنے جانشین حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم کے حوالے کر دیا۔ ہزار بارہ سو سال تک انسانیت کی فلاح و بہبود کا یہ عالمگیر نظام، ملت محمدیہ یا ملت حنیفیہ کی بنیاد پر انسانیت کے لیے ہمیشہ سے فائدہ مند رہا۔

اس ہزار سالہ زمانے میں یہ نظام نہ یہودیت کی بنیاد پر تھا، نہ عیسائیت، نہ علم نجوم، نہ علمِ طبیعیات اور نہ کسی عقل کی بنیاد پر تھا۔ ان چاروں علوم سے مدد تو لی جاتی تھی، ان کا انکار نہیں ہے۔ ستاروں کے اثرات اس کرۂ ارض پر پڑتے ہیں، طبیعیاتی قوانین اللہ ہی کے بنائے ہوئے ہیں، عقل کا بھی ایک کردار ہے۔ لیکن ان تمام کاموں میں کون سا کام جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے تعلق اور امن و امان، عدل و انصاف قائم کرنے سے متعلق ہے، صحیح ہے یا غلط، اس کا فیصلہ اس تدبیر کے تحت ہوا کہ سسٹم بنانے کا عمل، تدبیرِ الٰہی کی بنیاد پر ہوتا رہا۔ اگر سسٹم میں خیر اور صحت ہے تو اسے اختیار کرو اور اگر اس کے اندر، گمراہی ہے، کجی ہے تو رک جاؤ۔ جہاں نص آ چکی ہے، وہاں تدبیر کی بات نہیں ہے، سوچنے کی بات نہیں ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے واضح اور دو ٹوک حکم دے دیا۔ جو واضح احکامات ہیں، نماز، روزہ، عبادات یا قتلِ انسانیت وغیرہ، وہاں تدبیر کی بات نہیں دیکھی جائے گی، لیکن جہاں طبیعیاتی قوانین اور احکاماتِ الٰہی کے درمیان معاملہ آئے یا عقل اور اس کے درمیان معاملہ آئے، تو وہاں غور و فکر کرو، توجہ دو۔ اگر اس میں انسانیت کے لیے کوئی بھلائی ہے تو لے لو۔ اور بھلائی کے بارے میں اللہ نے تین باتیں واضح کر دی ہیں:

1۔ وہ کام تمام دنیا کے مسلمہ معروفات کے مطابق ہو، 2۔ وہ کام کسی انسان پر صدقہ و خیرات کرنے سے متعلق ہو، 3۔ وہ کام لوگوں کے درمیان جھگڑے نمٹانے سے متعلق ہو، تو وہ خیر ہے۔ اگر خیر سامنے آیا ہے تو جاری رکھو، چاہے علم نجوم کی تاثیر کو بنیاد بناؤ یا عقل کو بنیاد بناؤ یا طبیعیات کو بنیاد بناؤ۔ تاہم اگر اس میں شر ہو، بخل، منکر، جھوٹ، ظلم، زیادتی، حسد، کینہ، بغض اور فساد بین الناس کا عمل ہو تو اس سے رک جاؤ۔

یہ وہ حقیقی تعلیم تھی، جس کی بنیاد پر ایک ہزار سال خیر کا نظام قائم رہا۔ آج آپ کا وزیر داخلہ کہتا ہے کہ نظام کولیپس ہو چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ نظام تو تین سو سال پہلے کولیپس ہو چکا ہے، کیونکہ اس نظام کا جو نظریہ ہے، جس نظریے کے تحت یہ بنایا گیا تھا، وہ نظریہ انسانی نہیں رہا، خیر کا نہیں رہا، اصلاح بین الناس کا نہیں رہا، وہ فساد بین الناس ہے۔ جب سے ایسٹ انڈیا کمپنی 1757 میں بنگال پر قابض ہوئی ہے، وہاں کا نظام حکومت، نظام معیشت، نظام تعلیم، جتنے بھی زیریں نظام اس نظام حکومت کے ماتحت آتے ہیں، وہ کولیپس ہو گئے، خیر پر مبنی نظام نہیں رہا، نظام غلامی کا نظام بن گیا ہے''۔

www.rahimia.org

مفتی محمد اشرف عاطف، لاہور

سلطان سلیم اول کی دیگر فتوحات
اور حرمین شریفین کی سرپرستی وخدمات

سلطان سلیم اوّل نے اسماعیل صفوی کی افواج کو شکست وہزیمت سے دوچار کرنے کے بعد چند روز تبریز –جو اس وقت ایران کا دارالحکومت تھا– میں قیام کیا۔ مزید فتوحات کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے سلطان سلیم کا یہ منصوبہ تھا کہ موسم سرما آذر بائیجان کے میدانوں میں گزارنے کے بعد بہار کا موسم شروع ہونے پر فتوحات کا آغاز ہو، لیکن ترک فوج مسلسل مصر اور تبریز میں معرکہ آرائی کے بعد بالکل خستہ وتنڈھال ہوچکی تھی، اس لیے وہ آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ تھی۔ سلطان سلیم کو اندیشہ ہوا کہ سختی کرنے سے فوج میں بغاوت نہ ہوجائے، اس لیے مناسب یہ سمجھا کہ قسطنطنیہ کی طرف واپس ہوا جائے۔ اسماعیل صفوی سے بھی کسی طرح کا کوئی صلح نامہ نہیں ہوا تھا۔ اسی وجہ سے سلطان سلیم کی زندگی تک دونوں میں باہمی آویزش رہی۔ تاہم پچھلی جنگ کے نتیجے میں کردستان اور دیارِ بکر (جنوب مشرقی ترکی کے بالائی علاقے) کے صوبے سلطنتِ عثمانیہ میں شامل ہوگئے۔ سلطان سلیم کے لیے ایران کو بھی سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کرنا کوئی مشکل نہ تھا، لیکن کسی وجہ سے اس نے ایسا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

فتح شام ومصر! اس کے بعد سلطان سلیم شام کی طرف بڑھا۔ مصر وشام پر تقریباً اڑھائی سو برس سے سلاطینِ مملوک کی حکمرانی تھی۔ اور مصر کے حکمران کو حجاز کی فرماں روائی بھی حاصل تھی۔ حکومتِ مصر اور سلطنتِ عثمانیہ کے تعلقات سلطان سلیم کے والد بایزید کے زمانے سے ہی ناخوش گوار تھے۔ نیز یہ کہ حکومتِ مصر نے اسماعیل صفوی کی دعوت پر سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف ایران سے اتحاد کرلیا تھا اور کردستان اور دیارِ بکر کی فتح کے بعد عثمانی اور شامی سرحدات بھی ایک دوسرے کے قریب ہوگئی تھیں۔

اس صورتِ حال پر مشاورت کے لیے سلطان سلیم نے عمائدینِ سلطنت سے مشورہ کیا۔ مشورے میں یہ طے پایا کہ چوں کہ سلطانِ مصر نے شاہِ ایران سے معاہدہ کرکے سلطنتِ عثمانیہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ حاکمِ مصر سے اس کا جواب مانگا جائے۔ مصر کا مملوک حکمران اس وقت حلب (شام) میں مقیم تھا۔ چناں چہ طے پایا کہ پہلے مصر کے سلطان قانصوہ غوری سے اطاعت کا مطالبہ کیا جائے۔ چناں چہ سلطان سلیم نے ایک ایلچی اس پیغام کے ساتھ اس کے پاس بھیجا تو اس نے طیش میں آکر پیغام بر کو قید میں ڈال دیا۔

سلیم کو جب علم ہوا تو وہ فوج کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوا۔ جب عثمانی لشکر شام کی سرحد میں داخل ہوا تو سلطانِ مصر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے پیغامبر کو فوراً رہا کیا اور صلح کی گفتگو شروع کی جو ناکام رہی اور 24/ اگست 1516ء کو حلب کے قریب جنگ کا معرکہ بپا ہوا جس نے شام کی قسمت کا فیصلہ کردیا۔ گو مملوک فوج نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ لیکن عثمانی توپوں کی گولہ باری نے مصری فوج کو میدانِ جنگ میں ٹھہرنے نہ دیا اور ایک گھنٹے کے اندر لڑائی ختم ہوگئی۔ قانصوہ غوری نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو میدانِ جنگ سے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن اپنے ہی سپاہیوں کی بھیڑ میں دب کر مارا گیا۔ حلب کے شہریوں نے فاتح کی حیثیت سے سلطان سلیم کا خیر مقدم کیا اور سلطان سے وفاداری کا حلف اُٹھایا۔ مفتی احمد زینی دحلان –جو مکہ مکرمہ کے ممتاز شافعی عالم، مفتی، مؤرخ اور شیخ العلما ہیں– اپنی کتاب ''فتوحاتِ اسلامیہ'' میں رقم طراز ہیں کہ: ''حلب کے باشندے اپنے علما وصلحا کے ساتھ سلطان سلیم کے استقبال کو آئے، فتح کی مبارک باد دی اور رحم ودرگزر کے لیے خواست گار ہوئے۔ سلطان سلیم بھی ان کے ساتھ مہربانی اور حسنِ سلوک سے پیش آیا''۔

حلب کی فتح کے بعد دوسرے بڑے شہر دمشق، بیت المقدس اور حمص بھی آسانی سے فتح ہوگئے۔ ہر مسجد میں سلطان سلیم کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اسی دوران سلیم نے شیخ محی الدین عربی کے مزار پر حاضری دی اور وہاں کے فقرا کے لیے ایک مطبخ بنایا گیا۔ اس کے اخراجات کے لیے کافی جائیداد وقف کی۔ اسی طرح مصر بھی عثمانی افواج نے فتح کیا جس کے نتیجے میں مصر، شام اور حجاز عثمانی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ اس زمانے میں حجاز خصوصاً مکہ اور مدینہ یہ مصر کی حکومت کے کنٹرول میں تھے اور مصر پر مملوک سلطنت قائم تھی۔ جب مصر عثمانی سلطنت کا حصہ بن گیا تو حجاز بھی عثمانی سلطنت کے زیرِ کنٹرول آگیا۔ اگرچہ حجاز پر شریفِ مکہ کی حکومت تھی (حجاز اور مکہ ومدینہ کے حکمران کا لقب ''شریف'' تھا) مصر کی فتح کے بعد شریفِ مکہ نے سلطان سلیم اوّل کی اطاعت قبول کرلی اور سلطان کو اپنی وفاداری کا پیغام بھیجا اور اس طرح حجاز بغیر کسی جنگ اور مہم جوئی کے عثمانی اقتدار کے تحت آگیا۔ سلطان سلیم نے اپنے لیے خادم الحرمین الشریفین کا لقب اختیار کیا۔

حجاز خصوصاً مکہ اور مدینہ کی ترقی کے لیے سلطان سلیم نے بہت سے اقدامات کیے۔ مثلاً مکہ اور مدینہ کے امن وامان، زائرین کی حفاظت اور دیگر سہولتوں کے لیے مناسب انتظامات کیے، مختلف اطراف واکناف سے حج وعمرہ کے لیے آنے والے قافلوں کے لیے فوجی محافظ مقرر کیے تاکہ حجاج ومعتمرین راستے کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ مسجدِ حرام اور مسجدِ نبویؐ کی ضروری دیکھ بھال کے لیے مناسب اخراجات کی مستقل فراہمی کا بندوبست کیا، جس کو بعد کے عثمانی سلاطین خصوصاً سلیمان قانونی اور سلطان مراد رابع نے مزید وسعت دی۔

مفتی دحلان اپنی کتاب ''فتوحاتِ اسلامیہ'' میں لکھتے ہیں: ''سلاطینِ مملوک کی طرف سے شریفِ مکہ کو جو وظیفہ ملتا تھا، سلطان سلیم نے اس میں پانچ سو دینار کا اضافہ کردیا۔ حرم محترم کے دیگر خدام کی تنخواہوں میں اضافہ کیا۔ ہر سال حرمین کے لیے مصر سے جو غلہ آتا تھا، اس میں دو چند اضافہ کیا۔ اس داد ودہش اور امورِ خیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی عرصے میں حرمین میں ہر طرف معاشی خوش حالی تھی۔ سلطان سلیم کی اگرچہ آٹھ سال حکومت رہی، لیکن حجاز کو عثمانی سلطنت کی سرپرستی میں آنے سے ایک ایسی بنیاد قائم ہوگئی، جو تقریباً چار سو سال (1517ء تا 1916ء) تک قائم رہی۔

www.rahimia.org

عظمت کے مینار

وسیم اعجاز، کراچی

حضرت مولانا شائق احمد عثمانی بھاگلپوریؒ

امامِ انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے شاگردوں میں ایک اور نام حضرت مولانا شائق احمد عثمانیؒ کا بھی ہے۔ مولانا شائق احمدؒ ۲۵ / ربیع الاوّل ۱۳۱۱ھ / 5 / اکتوبر 1893ء بہار کے قصبہ پورینی (ضلع بھاگلپور) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ گرامی کا نام رافق علی تھا۔ یہ ایک علمی خاندان تھا۔ ابتدائی تعلیم پارینی اور مونگیر میں ''انجمن حمایت الاسلام'' سے حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے مدرسہ نعمانیہ پورینی میں داخل ہوئے، جہاں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے حسبِ حکم شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی امروہویؒ مدرس کے طور پر اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ مولانا موصوفؒ کی قابلیت کی بنیاد پر شیخ الادبؒ نے ایک بار فرمایا کہ: ''شائق احمد کا بے پڑھا (سبق) دوسروں کے پڑھے ہوئے (سبق) کے برابر ہوتا ہے''۔

حضرت مولانا محمد سہولؒ اور مولانا اعزاز علیؒ کے حسبِ حکم 1909ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور مزید تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران ''جمعیت الانصار'' کے نام سے ایک مجلس قائم ہو چکی تھی۔ اسی تناظر میں حضرت سندھیؒ کی تجویز پر ہی دارالعلوم دیوبند میں ''درجۂ تکمیل'' قائم کیا گیا تھا، جس میں ولی اللّٰہی علوم افکار پڑھائے جاتے تھے۔ مولانا موصوف اس درجے میں داخل ہو گئے۔ یہیں سے مولانا موصوفؒ کی سیاسی تربیت کا آغاز ہوتا ہے۔ تعلیم کے دوران ایک امتحان کے نتیجے پر حضرت شیخ الہندؒ نے آپؒ کے بارے میں لکھا تھا: ''الشّائق هو الفائق'' ۔ یہ جملہ دارالعلوم میں بہت مقبول ہوا۔ 1910ء میں حضرت شیخ الہندؒ سے حدیث کی تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت ہوئے اور دیوبند ہی میں مقیم ہو گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے تقسیم انعامات کے جلسے میں آپؒ کی قابلیت اور طرزِ تحریر کی خاص طور پر تعریف فرمائی۔ مولانا موصوفؒ 1913ء تک دارالعلوم میں مدرس کے طور پر ذمہ داریاں بھی نبھاتے رہے۔

دیوبند میں قیام کے دوران آپؒ کا تعارف امامِ انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے ہوا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے حکم سے جب امامِ انقلابؒ نے دہلی میں جا کر قرآنی علوم کے فروغ کے لیے ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' قائم کی تو مولانا شائق احمد عثمانیؒ نے اس میں شرکت کی اور حضرت سندھیؒ سے قرآنی سیاسیات کی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ مولانا عثمانیؒ ہی کی یہ روایت ہے کہ مولانا سندھیؒ کبھی اس طرح کا مضمون لکھنے کے لیے دیتے تھے کہ: ''اگر تمھیں ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا جائے تو تم ملک کا انتظام کس طرح کرو گے؟''۔ اس طرح حضرت شیخ الہندؒ کے واسطے سے ولی اللّٰہی علوم و افکار سیکھے اور حریت و آزادی کے عملی سیاسی کردار سے خود کو آراستہ کیا۔

انھیں قرآنی علوم کو عام فہم انداز میں عوام کے سامنے پیش کرنے کا بہت شوق تھا۔ 1917ء میں تیسویں پارے اور 1919ء میں انتیسویں پارے کی تفاسیر شائع کیں جو کہ بہت مقبول ہوئیں۔

بہار کے مختلف علاقوں میں جب فتنۂ قادیانیت نے سر اُٹھایا تو اس کی سرکوبی کے لیے وہاں کی ایک بزرگ شخصیت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ نے انتھک جدوجہد کی۔ مولانا عثمانیؒ نے ان کے ساتھ مل کر اس فتنے کے تدارک کے لیے کام کیا۔ اس مقصد کے لیے مولانا مونگیریؒ نے ایک پریس لگوا کے ماہانہ رسالہ بھی نکالا اور اس کی ادارت کی ذمہ داری مولانا موصوفؒ کو دی۔ 1920ء کے اوائل اور اس کے بعد کا عرصہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں نمایاں مقام کا حامل ہے۔ مونگیر میں تحریک خلافت کے ایک جلسہ ـــ جس کی صدارت مولانا شوکت علیؒ فرما رہے تھے ـــ میں حصہ لیا اور جوش و خروش کے ساتھ تحریک میں شامل ہو گئے۔ تحریکِ خلافت کے سلسلے میں ہی کلکتہ گئے اور وہاں بنگال خلافت کمیٹی سے منسلک ہو کر صیغہ نشر و اشاعت کے انچارج مقرر ہو گئے۔ اس طرح اپنے قلم کی طاقت سے تحریک کو بھرپور فائدہ پہنچایا۔ اگست 1920ء میں کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا، جس میں ترکِ موالات کا فیصلہ ہوا۔ اس تحریک میں بھی مولانا موصوفؒ شامل ہو گئے۔ کلکتہ قیام کے دوران مولانا محمد اکرم خان کے روزنامہ ''زمانہ'' میں مترجم کی حیثیت سے شامل ہو گئے، بعد ازاں اس روزنامہ کے انچارج بنا دیے گئے۔ اکتوبر 1921ء میں کلکتہ سے ایک رسالہ روزنامہ ''عصرِ جدید'' کے نام سے نکالا۔ اس رسالے میں تحریکِ آزادی سے متعلق مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ ابھی دو ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ تعزیراتِ ہند کی دفعہ 505 کے تحت مقدمہ چلا اور گرفتار ہوئے۔ علی پور جیل میں ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اس سزا کے دوران بنگالی زبان بھی سیکھی۔ اسی دن مولانا محمد اکرم اور مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی اسی دفعہ کے تحت کلکتہ سے گرفتار ہوئے تھے۔ اکتوبر 1922ء میں رہا ہوئے اور ''عصرِ جدید'' دوبارہ جاری فرمایا۔ یہ اپنے دور کا ایک یادگار اخبار تھا۔ 1924ء میں مولاناؒ نے اپنا ذاتی پریس بھی لگوا لیا۔

محمد ایوب قادریؒ کی تحریک پر اس روزنامہ کی مکمل فائل مولانا موصوفؒ نے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی کو دی جو کہ اس کی لائبریری میں اب بھی محفوظ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس روزنامے نے حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی پالیسی کو اختیار کیا اور مسلمانانِ ہند کو جمود اور تعطل سے نکال کر قوت اور عمل کی دعوت دی۔

قیامِ پاکستان کے بعد فروری 1948ء میں کراچی منتقل ہو کر یہیں مقیم ہوئے۔ روزنامہ ''انجام'' سے وابستہ ہوئے اور ''درسِ قرآن'' کے عنوان سے لکھنا شروع کیا۔ دسمبر 1951ء میں ایک بار پھر کراچی سے روزنامہ ''عصرِ جدید'' جاری کیا، لیکن وہ 3 سال جاری رہنے کے بعد ختم ہو گیا۔ اخیر عمر میں تحریر اور تدریس سے وابستہ ہوئے اور قلم سے یہ رشتہ آخری سانس تک نبھاتے رہے۔ ۲۰ / رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ / 26 / اگست 1978ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مرقد پر اپنی رحمت کی بارش برسائے اور ہمیں ولی اللّٰہیہ اکابرین کی اتباع کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

www.rahimia.org

Monthly RAHIMIA Lahore CPL No. 59

(بقیہ: ''نفس'' سے متعلق ''مقامات'' (4))

(حضرت سندھیؒ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: یعنی: وہ ایسا مقام ہے، جو ''مَلَکۂ عقل اور مَلَکۂ نفس سے مرکب ہوکر بنا ہے''۔) چناں چہ:

☆ ''جزع'' (مصیبت کے وقت شور شرابا کرنے) پر مبنی خیالات کے دفع کرنے کے ملکہ کا نام ''صبر علی المصیبة'' (مصیبت پر صبر کرنا) ہے اور اس کا ٹھکانہ دل ہے۔

☆ ''دعة (تعیش پسندی) اور فارغ البالی'' پر مبنی خیالات کو دور کرنے کے ملکہ کو جدوجہد اختیار کرنا اور ''صبر علی الطّاعات'' (نیکیوں پر صبر اور استقامت اختیار کرنا) کا نام دیا جاتا ہے۔ (حضرت سندھیؒ اس کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ: ''دعة'' کا معنی رفاہیت (تعیش پسندی)، یعنی ایسی ''رفاہیتِ بالغہ'' جو شریعت اور علمِ احسان کی روشنی میں ممنوع ہے۔)

☆ سستی اور کاہلی سے یا خلافِ شریعت چیزوں کی طرف میلان کی وجہ سے شرعی حدود کی مخالفت پر مبنی داعیے کی مدافعت کا ملکہ پیدا ہونا ''تقویٰ'' کہلاتا ہے۔

اور کبھی ''تقویٰ'' کا اطلاق تینوں لطائف (نفس، قلب اور عقل) کے تمام ''مقامات'' پر بھی کیا جاتا ہے، بلکہ اُن سے جو اعمال پھوٹتے ہیں، اُن پر بھی کیا جاتا ہے۔ تقویٰ کے اسی آخری استعمال پر (جس میں تینوں لطائف اور ان سے پھوٹنے والے اعمال شامل ہیں) اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ''هُدًى لِلْمُتَّقِينَ، الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ'' (2-البقرہ: 2-3) (یہ کتاب) پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہے، جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں)۔

☆ حرص اور لالچ کے داعیے کی مدافعت کے ملکہ کو ''قناعت'' کہتے ہیں۔

☆ جلد بازی کے داعیے کی مدافعت کے ملکہ کو ''تأنّی'' (ٹھہراؤ) کہتے ہیں۔

☆ غصے اور غضب کے داعیے کی مدافعت کے ملکہ کو ''حِلم'' (بُردباری) کہتے ہیں اور اس کا ٹھکانہ قلب ہوتا ہے۔

☆ شرمگاہوں کے داعیے کی مدافعت کے ملکہ کو ''عِفّت'' (پاک دامنی) کہتے ہیں۔

☆ خوب باتیں گھڑنے اور فحش گوئی کے داعیے کی مدافعت کے ملکہ کو ''صَمَت اور عِيّ'' (خاموشی اور غور و فکر کرکے بات کرنا) کہتے ہیں۔

☆ غلبے اور نمایاں ہونے کے داعیے کی مدافعت کے ملکہ کو ''خمول'' (زاویہ نشینی) کہتے ہیں۔

☆ محبت اور بغض وغیرہ میں جذباتیت کے داعیے کی مدافعت کے ملکہ کو ''استقامت'' کہتے ہیں۔

ان کے علاوہ نفس میں بہت سے داعیے اور خیالات ہوتے ہیں اور اُن کو دفع کرنے کے ملکات کے بہت سارے نام ہیں۔ یہ بحث ''فنِ اَخلاق'' سے متعلق ہے اور ہم۔ان شاء اللہ۔اس کتاب میں اس سے بحث کریں گے اور اس کتاب میں ان سے بحث نہیں ہے، بلکہ ان کی متفرق تفصیلات ''سطعات''، ''لمحات''، ''ہمعات''، ''الطاف القدس'' اور ''القول الجمیل'' میں کریں گے''۔

(أبواب الإحسان، باب: 4، المقامات والأحوال)

دینی مسائل

اس صفحے پر قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں!

از حضرت مفتی عبدالقدیر شعبۂ دارالافتا ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

سوال ماہِ ربیع الاول میں نبی کریم ﷺ کی سیرت بیان کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں پیشہ ور نعت خواں اور واعظ حضرات کو بیان کے لیے بلوانا کیسا ہے؟

جواب حضور اقدس ﷺ سے محبت ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ آج کے پُرفتن دور میں آں حضرتؐ کی سیرت کا تذکرہ کرنا باعثِ برکت ہے، لیکن جس بات کی طرف اس دور کے مجدد امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے توجہ دلائی، وہ یہ ہے کہ ہمارے سیرت نگار نبوت کو صرف آخرت کی زندگی سنوارنے تک محدود سمجھتے ہیں، جب کہ نبوت کا مقصد انسان کی پوری زندگی کی اصلاح اور تہذیب ہے اور نبوت حسنہ فی الدنیا اور حسنہ فی الآخرہ دونوں پر حاوی اور دونوں کی نگران ہے۔ (ازالۃ الخفاء، ج:2، ص:339، و342-343) سیرت نبویؐ کے مذاکرے کے سلسلے میں ہمیں ایسے واعظین اور سیرت نگاروں سے رہنمائی لینی چاہیے، جو اجتماعی سوچ کے حامل ہوں۔ پیشہ ور واعظین اور نعت خواں سے اجتناب لازم ہے۔ صحابہ کرامؓ کے متعلق آتا ہے کہ وہ غلط اور من گھڑت قصہ گو لوگوں کو مسجدِ نبویؐ سے نکال دیا کرتے اور انھیں مارا بھی کرتے تھے۔ حضرت ابو طالب مکیؒ نے ''قوت القلوب'' میں لکھا ہے کہ: ''ایک قصہ سنانے والا حضرت عائشہؓ کے حجرے کے سامنے بیٹھا قصے سنا رہا تھا تو حضرت عائشہؓ نے حضرت ابنِ عمرؓ کو پیغام بھجوایا کہ یہ آدمی مجھے تکلیف دے رہا ہے اور مجھے اپنے پڑھنے پڑھانے سے روک رہا ہے تو حضرت ابنِ عمرؓ نے اسے پیٹنا شروع کیا، یہاں تک کہ آپؓ نے اپنی لاٹھی اس کی کمر پر توڑ دی اور اس کو مسجدِ نبویؐ سے باہر نکال دیا''۔ (القول الجمیل، امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص:188)

بقیہ: قومی بحران سے قومی تشکیلِ نو تک

پاکستان کو آج مایوسی کی گہرائیوں میں جاتا دیکھنے کی بجائے اس کی عادلانہ اصولوں پر سماجی تشکیلِ نو کی ضرورت ہے، جس کے لیے سیاسی فکر، معاشی ترجیحات، تعلیمی نظام، ریاستی طرزِ عمل اور ہمارے اجتماعی رویوں میں بنیادی اور انقلابی اصلاح درکار ہے۔ ہمیں ایک ایسے پاکستان کی طرف بڑھنا ہوگا جہاں ریاست کی طاقت عوام کا اعتماد ہو؛ معیشت کا مقصد انسانی ضروریات کی تکمیل ہو؛ سیاست ذاتی اور گروہی اقتدار کی کشمکش کے بجائے اجتماعی بہبود کا ذریعہ بنے؛ اختلاف کو برداشت کیا جائے؛ اور دین کو تقسیم و کشمکش کے لیے استعمال کرنے کے بجائے عدل، انسان دوستی اور اجتماعی خیر کی قوت بنایا جائے۔

حضرت مولانا شاہ سعید احمد رائے پوریؒ کی زندگی اسی جدوجہد کا عنوان تھی۔ ان کی یاد کا سب سے بامعنی خراجِ عقیدت یہی ہوسکتا ہے کہ ہم ان کے روشن کردہ شعور کے چراغ کو لے کر اپنے عہد کے اندھیروں کو اجالوں میں تبدیل کر دیں اور قرآن و سنت، شاندار تاریخی ورثے، فکرِ ولی اللّٰہی اور اپنے اکابر کی جدوجہد کی روشنی میں ایک ایسے اجتماعی نظام کے قیام کے لیے فکری، اخلاقی اور عملی جدوجہد جاری رکھیں جس کی بنیاد عدل، آزادی، مساوات، انسانی احترام اور اجتماعی خیر پر قائم ہو۔ (مدیر)

مدیرِ اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے۔ جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ ''رحیمیہ'' رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے جاری کیا۔